یونانی اساطیر اور قصہ ہیر رانجھا

[1] ڈاکٹر منیر گجر [2] ڈاکٹر شبنم اسحاق

Abstract

The folktale of Heer and Ranjha had been undeniably the most favorite anecdote of the Punjab. There had been a long debate whether the characters and chronicles of the tale are factual or just a piece of fiction? Many a scholars are of the view that this romance reached the Punjab with the Greeks and turned into a local story with the passage of time. In the following article an effort has been made to establish the view that all the characters and events are purely indigenous and nothing has been imported. The resemblance of name of the Heer and Hera, the Greek goddess, is just a coincidence. To reinforce the viewpoint, the institution of Yoga and character of buffalo in Punjabi literature and culture has been discussed.

کلیدی الفاظ: **اسطورہ، یونانی اساطیر، لوک قصے، قصہ ہیر رانجھا**

چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر کی قیادت میں یونانی پنجاب آئے تو پہلی بار ان کی فوجی پیش قدمی کو کسی نے روکنے کی کوشش کی۔ یہیں سے ان کے دانت کھٹے ہوئے اور انھیں جنگ سے بیزاری ہونا شروع ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکندر کی فوج کے بہت سے سپاہی یونان واپس نہ گئے بلکہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مغربی پنجاب میں جھنگ اور سرگودھا ایسے علاقے ہیں جہاں یونانیوں کا اثر سب سے زیادہ ہوا۔ موجودہ جھنگ میں ہیر کے مقبرے کے بارے میں کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ یہ اصل میں یونانیوں کی دیوی ہیرا کی یادگار ہے۔ یونانی اساطیر میں ہیرا شادی اور شادی شدہ عورتوں کی دیوی ہے۔ یونانی جہاں بھی گئے انھوں نے ہیرا دیوی کے مندر تعمیر کیے۔

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو اور مشرقی زبانیں، یونیورسٹی آف سرگودھا
[2] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ پنجابی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

یونانی اساطیر کے مطابق وہ سارے دیوتاؤں اور مردوں کے باپ زیوس کی بہن تھی۔ زیوس اس پر عاشق ہو گیا اور اس سے شادی کر لی۔ جھنگ میں موجود ہیر کے مقبرے کی مماثلت اٹلی، یونان اور وسط ایشائی ریاستوں میں موجود ہیرا دیوی کی یادگار سے صرف اتنی ہے کہ ان عمارتوں پر چھت نہیں ہے اور ہیر کے مقبرے پر بھی چھت میں ایک غیر معمولی شگاف ہے۔ زیوس آسمانوں کا دیوتا تھا۔ ایک امکانی نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ یونانی ہیرا دیوی کے مندر کی چھت اس لیے نہیں بناتے تھے کہ ہر روز طلوع ہوتے ہی سورج کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑے۔

یونانی اساطیر میں ہیرا بہت دلیری کے ساتھ عشق کرنے کی وجہ سے مشہور ہے اور حسن میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ ہیرا دیوی کی دیومالائی کہانی یونانی سپاہیوں کے ذریعے پنجاب پہنچی اور بہلول لودھی کے سسی قصے میں ڈھل گئی۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی اس ضمن میں فرماتے ہیں:

> ''ممکن ہے خوبصورت ترین تصوراتی عورت ہیر کا سفر پہلے اسی دیومالائی یونانی حوالے سے سکندر کی افواج کے ساتھ ساتھ پنجاب تک پہنچا ہو، جو بعد میں ایک واقعاتی اور مقامی داستانی نام میں ڈھل گیا ہو، جو لودھیوں کے عہد میں وقوع پذیر ہوا اور پھر کبھی بطور اسمِ معرفہ کے کسی لڑکی کے لیے اختیار نہیں کیا گیا۔''(۱)

یونانی اساطیر میں دیونیسیئس شراب اور انگور کا دیوتا تھا۔ اس کے پجاریوں میں ایک گروہ آرفی مت ہوا ہے۔ جو تھریس کے باسی آرفیئس سے شروع ہوا۔ آرفیئس کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کا بتایا جاتا ہے۔ یعنی ہومر سے ۵۰۰ برس قبل اور حضرت عیسیٰؑ سے ۱۳۰۰ برس قبل۔ یونانی اساطیر میں وہ پیغمبر، شاعر اور موسیقار تھا۔ کچھ روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ وہ یونانی دیوتا اپالو کا بیٹا تھا۔ آرفی مت کے ماننے والوں کے بہت سے عقائد ہندوؤں سے مماثل ہیں، جیسے روح کا عقیدہ کہ انسان مرنے کے بعد اپنے اچھے یا بُرے کرموں کی وجہ سے پھر جنم لیتا ہے۔ یہ لوگ گوشت بھی نہیں کھاتے تھے۔ کبھی کبھار شراب کے نشے میں مست ہو کر سمجھتے کہ دیونیسیئس ان میں حلول کر گیا ہے۔

آرفیئس کی خوبیوں میں سے متعدد ایسی ہیں جن کی جھلک ہمیں رانجھے میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے وابستہ کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موسیقی سے ارد گرد کی ہر چیز پر سحر طاری کر دیتا تھا۔ یہیں سے ہم

رانجھے کے کردار میں اس کی پہلی پرچھایں دیکھتے ہیں۔ رانجھا بھی جب بانسری بجاتا تو چوگردے کی ہر شے کو مست کر دیتا۔ قصہ ہیر کے پہلے شاعر دمودر کے بقول:

؎ چڑھ و نجھلی جب واہی دھیدو کیہیاں سُراں اٹھائیاں
شینہہ، برنڈے، چیتے، مونی، سبھے زیارت آئیاں (۲)

مشہور یونانی شاعر پِنڈر (۴۴۳۔۵۲۲ق م) نے آرفیئس کو "Father of Songs" کا خطاب دیا۔ کلاسیکی دور کے یونانی آرفیئس کا سب سے مہان شاعر اور موسیقار کے طور پر احترام کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یونانی دیوتاؤں کے ہرکارے Hermes نے جو کہ ادب، کھیل اور شاعروں کا سرپرست تھا، یونانی موسیقی کا قدیم ساز Lyre ایجاد کیا۔ اس ساز کو زیادہ نکھار آرفیئس نے ہی عطا کیا۔ آرفیئس جب ساز بجاتا تو پرند، چرند اور وحشی جنگلی جانور مست ہو جاتے۔ درخت اور پتھر محوِ رقص ہو جاتے۔ ادھر رانجھے کی بانسری سے بھی بدمست شیر کو نیند آجاتی ہے:

؎ کھڑی بانہہ کوکے، مارے آہ نعرے، کھڑیا ہوئے کے رانجھے و نجھلی وجائی
و نجھلی سُن کے شیر جو مست ہویا، غالب نیند شیر نوں تُرت آئی (۳)

"Myth, Religion and Society" میں Marcel Detienne لکھتے ہیں:

> "It is because he is all honey, that Orpheus obliterates the boundaries between the wild and the cultivated and mixes marriage and seduction together. In the presence of Orpheus lions and bears live alongside roe and follow deer, and fiercest animals are gentler than lambs."(۴)

یہ تمام اوصاف ہمیں رانجھے کے کردار میں بھرپور طریقے سے ملتے ہیں۔ اس کی بانسری کے سامنے خونخوار جنگلی اور پالتو جانوروں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ جن جانوروں کا نام ہی خوف و دہشت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ وہ رانجھے کی بانسری سن کر سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح سر جھکائے چلے آتے ہیں:

ے تاں رانجھے ہتھ ونجھلی کیتی، کیہیاں سُراں الائیاں
شینہہ، برنڈے، چیتے، مونی، سبھے زیارت آئیاں (۵)

آرفیئس تو اپنی بیوی کے من میں پیار کی جوت جگاتا ہے، لیکن رانجھے کی بانسری کا جادو تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کنواری دوشیزائیں تو کُجا، شادی شدہ عورتیں بھی اپنے شوہر بُھلا کر رانجھے کے ساتھ ملاپ کے خواب بننے لگتی ہیں۔ صورتِ حال ملاحظہ کیجیے۔ رانجھا بھابیوں کے طعنوں سے اُکتا کر گھر چھوڑ دیتا ہے۔ پلے زادِ راہ نہیں ہے۔ دریا پر پہنچتا ہے تو لڈن ملاح مفت میں کشتی پر سوار ہونے سے منع کر دیتا ہے۔ بہت منت سماجت سے بھی نہیں مانتا بلکہ رانجھے کو کافی مغلظات بکتا ہے۔ دل جلا رانجھا ایک طرف بیٹھ کر بانسری بجانا شروع کر دیتا ہے۔ لڈن کی دونوں بیویاں اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں اور اس کی خاطر مدارت میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ وہ رانجھے کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:

ے سئیں ونجھیں جھناؤں دا انت ناہیں، ڈب مریں گا ٹھلھ نہ سجنا وو
چاہڑھ موڈھیاں تے تینوں اسیں ٹھلاں، کوئی جان توں ڈھل نہ سجناں وو
ساڈیاں اکھیاں دے وچ وانگ دِھیری، ڈیرا گھت بہو ہل نہ سجنا وو
وارث شاہ میاں تیرے چوکھنے ہاں، ساڈا کالجا سل نہ سجنا وو (۶)

آرفیئس کے ساتھ وابستہ کہانیوں میں سب سے مشہور اس کی بیوی Eurydice کی کہانی ہے۔ ایک شادی کے موقع پر جنگل کے لمبے گھاس میں سے گزرتے ہوئے وہ جنگل کی دیوی Aristaues کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ وہاں سے بچ نکلنے کی کوشش میں زہریلے سانپوں سے بھری کھائی میں جا گرتی ہے اور ایڑھی پر زہریلے سانپ کے ڈسنے سے ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کی موت پر آرفیئس ایسے دکھی گیت چھیڑتا ہے کہ سب دیویاں دیوتا رونا شروع کر دیتے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے مشورے پر ہی آرفیئس پاتال کا سفر کرتا ہے اور اپنی موسیقی سے پاتال کے دیوتاؤں کے من موہ لیتا ہے۔ Michael Grant کے بقول:

> "His singing had held all tartarus spell-bound and death's very home was shaken to hear that song; the furies and three-mounted Cerberus had been lulled, and lxion's wheel had ceased to turn."(۷)

پاتال کے دیوتا Hades کی بیوی Persephone نے آرفیئس کی بیوی کو اس کے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی۔ یونانی دیومالا میں اس سے قبل کسی کے پاتال سے واپس آنے کی مثال نہیں ملتی۔ Persephone نے آرفیئس کے لیے ایک شرط بھی رکھی کہ وہ اوپر والی دنیا میں پہنچنے سے قبل پلٹ کر نہیں دیکھے گا۔ آرفیئس اپنے مدھر گیتوں سے اس کی راہنمائی کرتے چلتا رہا پر اوپر پہنچتے ہی صبر کا دامن چھوڑ بیٹھا اور پلٹ کر دیکھ لیا۔ اس کے پلٹتے ہی پر سیفن ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی۔**(۸)**

قصہ ہیر کے لگ بھگ سبھی شعراء نے پانچ پیروں کا ذکر کیا ہے۔ یہ پانچ پیر کسی فوق الفطرت کردار کی طرح ہر مشکل وقت میں رانجھے کی مدد کے لیے وارد ہوتے ہیں۔ یہ رانجھے کی بانسری کے دیوانے ہیں۔ اس کی بانسری سن کر ہی انھوں نے رانجھے کو ہیر عطا کی تھی۔ اوپر والی کہانی میں آرفیئس کی موسیقی اور رانجھے کی بانسری کے تاثر میں مماثلت پر ذرا غور کریں۔ دمودر کے بقول:

تاں کُھن حقیقت راضی ہوئے، رانجھے ونجھلی واہی
للت راگ وچ واہی ونجھلی، پیراں چنگی بھائی
ہک ہک وتھ دتی لے سبھناں، خاطر ایہہ رضا ای
آکھ دمودر ہیر ولیہاں، رانجھے پلے پائی **(۹)**

یونانی متھالوجی کے کرداروں اور کہانیوں کے ساتھ سانجھ کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ یہ رومانی قصہ کوئی بیرونی یا درآمد شدہ کہانی ثابت ہوتی ہے۔ ان مشترک خصوصیات یا واقعات کی طرف دھیان دلوانے کا مقصد یہ ہے کہ انسان یا لسانی گروہ جب کسی دوسری جگہ جا کر بسیرا کرتے ہیں تو ان کے ساتھ بہت سی باتیں سفر کرتی ہیں۔ زبانوں کے دن بہ دن بدلتے رنگ اور لفاظی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ادب میں یہ لین دین ہمیشہ سے چلتا رہا ہے اور ہمیشہ چلتا رہے گا۔ دوسری بات یہ کہ پوری دنیا کی لوک کہانیوں کے موضوعات کہیں نا کہیں ایک دوسری سے مل جاتے ہیں، کیوں کہ سبھی انسانوں کے جذبات، خواہشات اور سوچ جبلی حوالے سے ملتی جلتی ہیں۔ مثال کے طور پر یونانی دیومالا میں دیویاں، دیوتا کرشمے دکھاتے ہیں اور پنجاب کی لوک داستانیں زیادہ تر مسلمان لکھاریوں نے قلم بند کی ہیں تو ان میں پانچ پیر اور خواجہ خضر جیسے کردار وارد ہوتے ہیں جو کہ اسلامی اثر کے تحت قصوں میں آئے۔ لوک داستانیں معاشرے سے جنم لیتی ہیں اور کوئی بڑا شاعر انھیں نظما کر

امر کر دیتا ہے اور یوں یہ تحریری ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اب یہ شاعر کا کمال ہے کہ وہ قصے کی بُنت کو حقیقت کے کتنا قریب رکھتا ہے۔ شاعر کی اپنے سماج سے جڑت اور مشاہدہ جتنا گہرا ہو گا اتنا ہی اس کی بات میں رچاؤ اور رس ہو گا۔ یہ کہانیاں شروع سے ہی سندھ وادی کے مزاج کا حصہ ہیں۔ مسلمانوں کی آمد سے ادبی ریت مضبوط ہوئی تو ان کہانیوں میں اسلامی رنگ شامل ہو گیا۔ نتیجتاً صوفیا نے اپنی روحانی وارداتوں کے بیان کے لیے بھی ان قصوں کے کرداروں کو تشبیہہ اور استعارے میں ڈھالا۔ عبدالسلام خورشید کے بقول:

> ''اگر وسیع بنیادوں پر پنجاب کے کلاسیکی ادب کا ایک سائنسی تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ابتداء میں لوک گیت تھے، ان گیتوں میں بعض رومانوں کو مختصر طور پر بیان کیا گیا۔ اس کے بعد تحریری ادب کا آغاز انہی رومانوں کی تفصیل کو ادبی رنگ میں پیش کرنے سے ہوا اور صوفیانہ شاعری کا ڈھانچہ بھی انہی رومانوں پر قائم ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پنجاب کے لوک رومان کتنی بڑی ادبی اور ثقافتی اہمیت کے مالک ہیں ۔''**(۱۰)**

لگ بھگ ہر ہیر نگار نے رانجھے کے جوگی بننے کی بات کی ہے۔ اکثر نے یہ بھی لکھا ہے کہ رانجھا جوگی پنتھ کی تربیت لینے بالناتھ کے پاس گیا جو ٹلہ جوگیاں (موجودہ ضلع جہلم، پنجاب، پاکستان) میں مقیم تھا۔ یہ ایسا نکتہ ہے جس پر تھوڑا سا غور کرنے سے اسے قصہ ہیر رانجھا کو خالصتاً دیسی قصہ ہونے کی دلیل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے پنجاب میں جوگ پنتھ کی روایت پر مختصراً بات کرنا ضروری ہے۔ جوگ، جسے سنسکرت میں یوگ کہا جاتا ہے، کا مطلب ہے جُڑنا، میل، ملاپ وغیرہ۔ جوگ کا تعلق انسان کے اندرون سے ہوتا ہے۔ جوگ کے بارے میں اس خطے کی پرانی مذہبی کتابوں ''رِگ وید''، اُپنشد'' اور ''گیتا'' میں اشارے ملتے ہیں۔ جوگ کی اصطلاح کو فلسفیانہ معنی پتنجلی نے دیے۔ ڈاکٹر رادھا کرشن لکھتے ہیں:

> "The word Yoga is used in a variety of senses. It simply means "methods". It is often used in the sense of yoking. In the Upanisads and Bhagwatgita, the soul in its worldly and sinful condition is said to live separate and estranged from the supreme soul. The root of all sins and

suffering is separation, disunion, estrangement to be rid of sorrow and sin, we must attain spiritual unification, the conscious of two in one or yoga. In Patanjli, the yoga does not mean union, but only effort, or as bhoja says, separation (viyoga) between Purusa and Parbati.(۱۱)

روح کی یہ ازلی جدائی آگے چل کر پنجابی صوفی شعریت کا سب سے بڑا موضوع بنی۔ اس موضوع کو بیان کرنے کے لیے صوفی شعراء نے اس دھرتی کے رومانی کرداروں ہیر اور رانجھے کو استعارہ بنایا۔ تصوف کی راہ میں سلوک کی مختلف منازل کو بیان کرنے کے لیے بھی اس قصہ کے کردار اور واقعات وسیلہ بنتے رہے ہیں۔

ہندو متھالوجی کے مطابق جوگ کا پنتھ مہادیو سے شروع ہوا۔ وہ خود بھی جوگ کی منازل طے کیے ہوئے تھے۔ ''شری شو مہاپران'' کے 'ترتیہ کھنڈ' میں لکھا ہوا ہے:

''برہما جی بولے... 'ہے نارد! ہمیں سرو پرتھم اس یوگی کے پاس پہنچ کر اس کی پریکشا لے لینی چاہیے۔''(۱۲)

قصہ ہیر کے سب سے باکمال شاعر وارث شاہ نے بھی اس بات کی تائید کچھ یوں کی ہے:

''مہاں دیو تھوں جوگ دا پنتھ بنیا، کھڑا اکٹھن ہے جوگ مہم میاں۔''(۱۳)

دسویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک برصغیر میں اور بالخصوص پنجاب میں ناتھ اور سدھ جوگیوں کو فکری عروج حاصل تھا۔ دسویں صدی میں ناتھ پنتھیوں نے اسے باقاعدہ تحریک کا روپ دیا۔ تاریخ میں ناتھ پنتھ کے بانی مچھندر ناتھ ہیں مگر ان کے چیلے گورکھ ناتھ کی بدولت یہ پنتھ عروج پر پہنچا۔ اس کی شخصیت سے وابستہ بہت سی کرامات آج بھی پنجاب میں مشہور ہیں۔ برصغیر میں 'نو ناتھ اور چوراسی سدھ' آج بھی مشہور ہیں۔ ''ربا کسے سدھ دے متھے لائیں'' آج بھی پنجاب میں دعا کے طور پر مقبول ہے۔ سدھوں اور ناتھوں کی مشترکہ خصوصیات کی وجہ سے انھیں عام طور پر ایک ہی دبستان کے طور پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ فلسفیانہ سطح پر ان میں بہت فرق ہے۔ ''انسائیکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر'' میں اس فرق کو یوں واضح کیا گیا ہے:

"The Sidhas were traditionally atheists (Anatma-

Vadin) and antagonistic to the Vedas while the Nathas were theistic (Atma-vadin). Both of them were contemporaneous and tantric elements were common to them. Contrasting conceptions regarding the nature of Shiva and Shakti Separated them. The Nathas Strictly followed celibacy; but the Sidhas did not, nor did they quote any commonly accepted scripture as their accepted scripture as their testimony."(۱۴)

ان سدھ اور ناتھ جوگیوں کا احترام پنجاب میں کسی فرقے یا مذہب کی تخصیص کے بغیر شروع سے ہی ہوتا آیا ہے۔ اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ جوگی قریہ قریہ گھومتے تھے۔ ان کی زندگی کا تجربہ اور سماج کا مشاہدہ عام لوگوں سے کہیں گہرا ہوتا تھا۔ نگر نگر گھومنے سے یہ ایسی جڑی بوٹیوں اور پتھروں سے بھی شناسا تھے جو کسی نا کسی بیماری میں دوادارو کا کام دیتے تھے۔ یوں یہ چلتے پھرتے معالج تھے۔ یہ خود کو سخت جسمانی ریاضتوں سے گزار کر اپنے حواس اور جُثے پر یوں قابو پا لیتے تھے جو عام طور پر عقلی دلیل سے باہر دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر سخت گرمی میں تپتی ریت پر لیٹ جانا، جان لیوا سردی میں یخ بستہ پانی میں بیٹھ رہنا، آگ میں سے جلے بغیر گزر جانا، ہوا میں اُڑنا وغیرہ۔ ان کا فلسفہ بھی یہی تھا کہ انسان اپنی جسمانی ضروریات اور خواہشات پر نا صرف قابو پا سکتا ہے بلکہ ان کو تابع کر کے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ رادھا کرشن کے خیال میں:

"Yoga according to Patanjali, is a methodical effort to attain perfection, through the control of the different elements of human nature, physical and metaphysical, the physical body, the active will and the understanding mind are to be brought under control. Patanjali insists on certain practices which are intended to cure the body of

its restlessness and free it from its impurities. When we secure through these paractices increased vitality, prolonged youth and longevity, these are to be employed in the interests of spiritual freedom.''(۱۵)

جسمانی خواہشات اور حسیات کو تابع کر کے اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی وجہ سے ہی ان جوگیوں کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ پنجاب کی روزمرہ زندگی کا حصہ بن گئے اور لوک داستانوں میں بھی آ گئے۔ بقول ڈاکٹر سعید بھُٹا:

''ناتھ جوگیوں نے وادی سندھ کی ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ پنجابی کی کلاسیکی داستانیں 'ہیر رانجھا' اور 'پورن بھگت' کے ہیرو جوگ لیتے ہیں۔ ان داستانوں کو سینکڑوں شاعروں نے نظم کیا ہے۔ اس طرح جوگ مت کے بارے میں ان ادبی فن پاروں سے بھی معلومات ملتی ہیں۔ ان شعراء میں وارث شاہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے ناتھ فکر بھی بیان کر دی ہے اور زوال پذیر پنتھ کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی تک ناتھ جوگی پنجاب کے دیہات میں کس قدر مقبول تھے۔''(۱۶)

اوپر ہم نے پنجاب میں ناتھ پنتھی جوگ ریت کا جائزہ لیا ہے۔ قصہ ہیر رانجھا میں جوگ ریت اور بھینس کا ذکر دو ایسے اشارے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ اس قصے کی جڑیں اسی دھرتی میں ہیں اور اس کے تانے بانے میں کچھ بھی مستعار لیا ہوا نہیں ہے۔ سَو سے زائد ہیر نگاروں میں اور کوئی اختلاف ہو تو ہو، یہ دونوں باتیں سبھی کے ہاں مشترک ہیں۔ جوگ ریت پنجاب میں اس قدر قدیم ہے کہ اس کا ذکر یونانیوں کی یہاں آمد سے بہت پہلے لکھی گئی ''رگ وید'' میں بھی ملتا ہے۔ اس ریت کا سارا رنگ دیسی ہے۔ یہ اسی خطے سے پیدا ہوئی اور کسی مذہب یا فرقے کے رنگ میں رنگے جانے کی بجائے اس نے اپنی انفرادیت ہمیشہ قائم رکھی۔ پنجاب کی دو بڑی رومانی داستانوں 'ہیر رانجھا' اور 'سوہنی مہینوال' میں بھینس چرانے والے ہیرو ہیں۔ بھینس کے ساتھ پنجابیوں کا موہ اور رشتہ تو کسی تعارف کا محتاج نہیں، یہاں صرف یہ بتانا ضروری ہے کہ بھینس کے بارے میں

ہوئی تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ اپنی اصل میں یہ جانور سندھ وادی سے ہی تعلق رکھتا ہے۔**(۱۷)**

قصہ ہیر رانجھا میں رانجھا بھینسیں چراتا ہے جب کہ یونانی قصوں میں بھینسوں کا ذکر ہی نہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے قصہ ہیر کے سبھی شاعروں کے ہاں اور کوئی اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن بھینس کا بھرپور ذکر لگ بھگ ہر شاعر کے پاس ملتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ برِ صغیر میں بھینس کی موجودگی اور پنجابی ادب میں اس کے ذکر کے حوالے سے چند بنیادی حقائق سامنے لائے جائیں۔ بھینس پانی کا جانور ہے۔ پنجاب میں وافر پانی اور کھلی چراگاہیں بھینس کی افزائش کے لیے بہت سود مند تھیں۔ یہاں بہتے دریاؤں کے وسیلے سے ہر طرف ہریالی اور خوش حالی تھی۔ یہاں کے سات دریاؤں کا ذکر آریاؤں نے رگ وید میں بھی کیا ہے:

> "Him whose fame spreads between wide earth and heaven, who as dispenser, gives each chief his portion, Seven flowing Rivers glorify like indra. He slew Yudhyamadhi in close encounter."**(۱۸)**

اقوام متحدہ کے ادارے United Nations Food and Agricultural Organization نے ۲۰۰۰ء میں ایک رپورٹ جاری کی جس کی رو سے دنیا میں بھینسوں کی گنتی ۱۵۸ ملین ہے۔ ان میں سے ۹۷ فیصد صرف ایشیا میں پائی جاتی ہیں**(۱۹)**۔ اسی ادارے نے ۱۱ جون ۲۰۰۸ء کو ایک اور رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا کہ بھینس کے دودھ اور اس سے بننے والی اشیاء گھی، پنیر وغیرہ کی پیداوار کے حوالے سے دنیا کے دس بڑے ملکوں میں ہندوستان پہلے اور پاکستان دوسرے نمبر پر ہے**(۲۰)**۔ یہاں ان معلومات کے تذکرے کا مطلب یہ ہے کہ آج کے جدید اور مہنگے دور میں جب کہ بھینس رکھنا یا پالنا اچھا خاصا دقت طلب شوق ہے تو بھی اس خطے میں پائی جانے والی بھینسیں ساری دنیا سے زیادہ ہیں، جب آریہ آئے ہوں گے تو بھینسوں کی گنتی کیا ہو گی؟

سندھ وادی میں بھینس کو شروع سے ہی بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ پنجاب کے باسی گائے کے مقابلے میں بھینس کو ہی زیادہ پسند کرتے اور سراہتے آئے ہیں۔ پنجابی ادب میں بھینس کے ذکر کے بارے میں

بات کریں تو لوک ادب سے لے کر قصہ ادب اور کلاسیکی ادب میں شاعروں اور قصہ کاروں نے بھینس کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ پڑھنے والے کے تصور میں بھینس پریوں سے زیادہ خوبصورت دکھائی دینے لگتی ہے۔ سوہنی کا عاشق عزت بیگ بھینسیں چرانے کی وجہ سے مہینوال بن گیا اور دھیدو رانجھے کو بھی بھینسیں چرانا پڑیں۔ پنجاب کے یہ دونوں رومانی قصے سیکڑوں شاعروں نے لکھے اور یوں بھینس کا حسن پنجابی ادب کا ایک باقاعدہ موضوع بن گیا۔ پنجاب میں آج بھی بھینسوں کے لیے لکھے جانے والے ڈھولے ہر دلعزیز ہیں۔ بھینسوں کے ڈھولوں کی وجہ سے مشہور کیا ڈھاڈی ایک جگہ بھینس کے حُسن کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

کئیں کیلیاں، کالیاں، بھبھاسیاں، اڈیاں، بگیاں تے چُور کڈھیاں
جیوں چُوڑا سوہندا ہے نورنی نارنوں
نھا کے دریا چوں نکلیاں ہن، جیویں شیشے سوہن بازار نوں
پچھلی راتیں کھاریں لگھ کے دیون سُنکاں تے دُھنکاں
الاپے آسا، بھیرویں، پیلوں، پہاڑی، رام کلی تے میگھ ملھار نوں(۲۱)

پنجابی لوک وار کار میر چوغطہ ایک وار کے ''وچار'' میں بھینس کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

''بھاگ مجھ کیہو جیہی ہائی؟ جیویں سلھیٹیاں اچ ہیر، ٹمن دے برچھے ہاٹھ اچ ہوندن۔ جیویں رُکھاں چوں توریاں آلی ٹاہلی۔ ٹھلھاں چ کڑانہ ہے۔ بھاگ مجھ ایہو جیہی ہائی۔ دِلے دی ہینہہ نال بجھدی ہائی۔ کولی داوال ہا۔ بھاگ مجھ داچونا ساون ماہ داہڑھ۔ بھاگ دودھوں کدی ناہی سُکدی۔ جیویں پھتو دا سر، سراں دے وچوں سوکا کدی نہ آیا۔ بھاگ مجھ نوں دودھ داسوکا کدی نہ آیا۔''(۲۲)

بھینس کے ساتھ پنجابیوں کا پریم کوئی آج کی بات نہیں۔ پنجابی کے پہلے باقاعدہ شاعر اور انسان دوستی کے علم بردار بابا فریدؒ کے ہاں بھی بھینس کے دودھ کا ذکر ربی نعمتوں کے طور پر ملتا ہے:

فریدا شکر، کھنڈ، نوات، گڑ، ماکھیوں، ماجھا دودھ(۲۳)

پنجاب میں شروع سے ہی بھینس کو ایک قابلِ فخر سرمایہ سمجھا گیا ہے، عزت اور شان کی علامت۔ چناب کے علاقوں میں آج بھی بھینس کی چوری کو مالی نقصان سے زیادہ عزت کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ مالی نقصان تو

قابلِ برداشت ہے لیکن بھینس کی چوری مالک کی عزت پر بٹا ہے۔ اس کی تلافی کے لیے جنگ چھڑ سکتی ہے، جانیں جاسکتی ہیں۔ پنجابی کے لوک وار لکھاری میر چوغطہ ''للیریاں اعواناں دی وار'' میں اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

''گاں دا ریڈھ ہووے چنھاں دی کدھی تے کنونی نوں کھرِک۔ مجھ دا ریڈھ ہووے
پھپھردے ٹوٹے، کلیجے نوں دھک، گاٹے دی رت، عمر نوں ور ھیوں۔''(۲۴)

یعنی گائے کی چوری ایسے ہے جیسے کان کُھجانا جبکہ بھینس کی چوری جگر کے ٹکڑے ہونا، شہ رگ کٹ جانا یا عمر بھر کا روگ ہے۔

قصہ ہیر رانجھا میں یونانی پرچھائیاں اس لیے دکھائی دیتی ہیں کہ یونانی جب پنجاب میں آئے تو مغربی پنجاب کا ضلع جھنگ وہ علاقہ ہے جہاں ان کا بہت زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔ اُس وقت ہر بڑی انسانی آبادی کسی نہ کسی دریا کے کنارے ہی ہوتی تھی اور جھنگ کی سر زمین پر دو بڑے دریا جہلم اور چناب آج بھی بہتے ہیں۔ یونانیوں نے یہاں قیام کیا۔ دیسی لوگوں میں گھل مل گئے۔ شادیاں کیں۔ آج بھی جھنگ کے کچھ قبائل کے بارے میں دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ یہ یونانی النسل ہیں۔ ہیر کے مقبرے کی موجودہ جگہ پر ہوئی کھدائیوں سے یہاں موجود کھنڈرات کا تعلق یونانیوں سے بھی قدیم دور سے جوڑا جاسکتا ہے۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی لکھتے ہیں:

''۱۹۷۴ء میں محکمہ آثارِ قدیمہ نے اس ٹیلے کے زیریں حصے کی جزوی کھدائی کرائی جہاں ہیر کا مزار واقع ہے۔ چنانچہ ۱۴x۱۶ کی جو قدیم پختہ اینٹیں یہاں سے دستیاب ہوئی تھیں ان کے سائنسی تجزیے کے بعد یہ رپورٹ دی گئی کہ یہ چندر گپت موریہ اور سکندر یونانی سے ذرا پہلے کے زمانے کے ہیں۔''(۲۵)

کھنڈرات کی کھدائی کا تعلق ہماری دانست میں ادب سے زیادہ Archaeology سے ہے۔ جھنگ سے یونانیوں کے آثار کھوجے جانے کا مطلب ہے کہ یونانی اس خطے میں آئے۔ اس بات سے تو کوئی انکار نہیں۔ یہ سچ ہے کہ یونانی جھنگ کے دیسی سماج کا حصہ بن گئے اور ان کی زبان کے بہت سے الفاظ دیسی بولی کا حصہ بنے اور آج بھی مستعمل ہیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود قصہ ہیر رانجھا کا تعلق کسی یونانی قصے سے نہیں جوڑا جا

سکتا۔ ہیر اور ہیر ادیوی میں صرف ایک قدر مشترک ہے کہ ہیر ادیوی اپنے حُسن کا ثانی نہیں رکھتی تھی اور ہیر کا سراپا بھی ہیر نگاروں نے بہت مثالی تخلیق کیا ہے۔ کہانی کے پہلو سے تو ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہیر ادیوی ایک صنمیاتی کردار ہے اور ہیر ایک جیتا جاگتا کردار جس کی حقیقی طور پر موجودگی کے کئی ثبوت دستیاب ہیں۔ ہیر ادیوی کی شادی اپنے ہی بھائی زیوس سے ہوئی جبکہ مشرقی سماج میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قصہ ہیر رانجھا خالصتاً ایک مقامی قصہ ہے۔ جن دانشوروں نے ہیر کی کہانی کو ہیر ادیوی کی کہانی کا ہی دیسی روپ کہا ہے وہ شاید مغربی دانشوروں سے زیادہ ہی متاثر بلکہ مرعوب ہیں۔ مغربی دانشوروں کا یہی خیال ہے کہ ہر اچھی تخلیق جو ادب یا فن کے احاطے میں آتی ہے، مغرب یا یونان کی پیداوار ہی ہو سکتی ہے۔ ہمارے پاس تو جیسے ہر چیز درآمد شدہ ہے اور ہم ہر اچھی چیز کی صرف نقل ہی تیار کر سکتے ہیں۔ زبان کی بات ہو، ادب کی یا ثقافت کی، یہ دانشور ہر شاہکار تخلیق کو بنا کسی ثبوت کے مغربی دیسوں کے کھاتے میں ڈال کر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ سوچ اپنی جگہ بہت مضحکہ خیز ہے کہ ترقی پذیر یا پسماندہ دیسوں کی کوئی ادبی ریت ہی نہیں ہوتی یا ان کی کوئی زبان نہیں ہوتی اور ان کی ہر اچھی تخلیق کی جڑیں کہیں باہر سے ہی کھودنا ضروری ہیں۔ ہڑپا تہذیب کی کھدائی نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے پاس یونانیوں کی آمد سے ہزاروں برس پہلے سے ایک بھرپور اور ترقی یافتہ سماج موجود تھا۔ ہڑپا کا سماج ہزاروں میل میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر مضبوط سماجی روایات کے ہوتے ہوئی ہمیں سب کچھ باہر سے ہی لینا پڑے؟ یونانیوں کا اس خطے میں آنا تاریخی سچائی ہے۔ یونانیوں سے قبل آریہ بھی تو آ کے اس خطے کے لوگوں میں ضم ہو گئے تھے۔ نسلی گروہوں کا ایک سے دوسری جگہ جانا ہمیشہ سے ہی تاریخ کا حصہ رہا ہے اور اس سے زبان و ادب میں دوسری زبان یا ثقافت کے رنگ دکھائی دے جانا عین فطری ہے، لیکن یہ امر بعید از عقل ہے کہ سارا کچھ ہی باہر سے لا کے اسے دیسی رنگ دیا جا سکے۔

حوالہ جات:

۱۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، **سر زمینِ جھنگ**(لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۳۷۔

۲۔ دمودر داس، **ہیر دمودر**، مرتبہ: محمد آصف خاں (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۰۲۔

۳۔ احمد گجر، **ہیر احمد گجر**، مرتّبہ: سید سبط الحسن ضیغم (اسلام آباد: لوک ورثہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۲۴۔

4. Marcel Detienne, "The Myth of Honeyed Orpheus", in Myth, Religion and Society", Ed. R.L.Gordon (Cambridge: Cambridge University Press, 1986), 105.

۵۔ دمودر داس، **ہیر دمودر**، ص ۸۹۔

۶۔ وارث شاہ، **ہیر سید وارث شاہ**، مرتّبہ: شیخ عبدالعزیز (لاہور: پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۶۰ء)، ص ۴۸۔

7. Michael Grant, Myths of Greeks and the Romans, (London: Weidenfeld and Nicolson, 1963) P51.

8. Ibid

۹۔ دمودر داس، **ہیر دمودر**، ص ۸۳۔

۱۰۔ عبدالسلام خورشید، **پنجاب کے رومان**، (لاہور: قومی کتب خانہ، ۱۹۵۰ء)، ص ۱۲۔

11. Radhakrishnan, Indian Philosophy, (London: George Allen & Unwin Ltd, 1966), P337.

۱۲۔ **شری شِو مہاپران**، (دہلی: دیہاتی پُستک بھنڈار، س ن)، ص ۱۵۳۔

۱۳۔ وارث شاہ، **وارث شاہ**، ص ۲۹۱۔

14. Encyclopaedia of Indian Literature, Vol.III, (Delhi: Sahitya Akademi, 1995), P2915.

15. Radhakrishnan, P338.

۱۶۔ سعید بھُٹا، ''قبل از فرید پنجاب کے ادبی رجحانات''، مشمولہ: جرنل آف ریسرچ، (ملتان: شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۷۲۔

17. "Water Buffalo, A Rare Breed of South-East Asian Origin"

<http:// www.rarebreeds.co.nz/ buffalo.html>Accessed 10 December 2016.

18. Ralph, T.H.Griffith, Hymns of the Rgveda, vol.II, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi, 1987, P21.

19. "Water Buffalo: An Asset Undervalued"<http://www. apcha.org/ publications/files/w_buffalo.pdf>Accessed July 16.2011.

20. Water Buffalo http://en.wikipeida.org/wiki/water_buffalo Acccessed july 30, 2011.

۲۱۔ سعید بھٹا، **کمال کہانی**، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۶۱۔

۲۲۔ سعید بھٹا، **دیس دیاں واراں**، (لاہور: پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۳۳۔

۲۳۔ بابا فرید، **آکھیا بابا فرید نے**، مرتبہ: محمد آصف خاں، (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۷۰۔

۲۴۔ سعید بھٹا، دیس دیاں واراں، ص ۳۳۰

۲۵۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، **سر زمینِ جھنگ**، ص ۱۳۴۔

اردو، پنجابی کتب:

- سعید بُھٹا۔ **دیس دیاں واراں**۔لاہور: پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر، ۲۰۰۷ء۔
- سعید بُھٹا۔**قبل از فرید پنجاب کے ادبی رجحانات**۔ملتان: شعبہ اردو، جرنل آف ریسرچ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء۔
- سعید بُھٹا۔**کمال کہانی**۔لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔
- خورشید، عبدالسلام۔**پنجاب کے رومان**۔لاہور: قومی کتب خانہ، ۱۹۵۰ء۔
- دمودرداس۔**ہیردمودر**۔مرتبہ: محمد آصف خاں۔لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۶ء۔
- **شری شِو مہاپران**۔دہلی: دیہاتی پُستک بھنڈار، س ن۔
- فرید، بابا۔**آکھیا بابا فرید نے**۔مرتبہ: محمد آصف خاں۔لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۷۸ء۔
- قریشی، سمیع اللہ، پروفیسر۔**سر زمینِ جھنگ**۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء۔

- گجر، احمد۔ **بیر احمد گجر**۔ مرتّبہ: سید سبط الحسن ضیغم۔ اسلام آباد: لوک ورثہ، ۱۹۹۲ء۔
- وارث شاہ۔ **بیر سید وارث شاہ**۔ مرتّبہ: شیخ عبدالعزیز۔ لاہور: پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۶۰ء۔

English Books

- Detienne, Marcel. "The Myth of Honeyed Orpheus". in Myth, Religion and Society", Ed. R.L.Gordon. Cambridge: Cambridge University Press, 1986.
- Encyclopaedia of Indian Literature. Vol.III. Delhi: Sahitya Akademi, 1995.
- Grant, Michael. Myths of Greeks and the Romans. London: Weidenfield and Nicolson, 1963.
- Griffith, Ralph, T.H. Hymns of the Rgveda. vol.II. Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi: 1987.
- Radhakrishnan. Indian Philosophy. London: George Allen & Unwin Ltd, 1966.

Online Resources

- "Water Buffalo: An Asset Undervalued". <http://www. apcha.org/ publications/files/w_buffalo.pdf>Accessed July6.2011.
- "Water Buffalo, A Rare Breed of South-East Asian Origin". <http:// www.rarebreeds.co.nz/ buffalo.html>Accessed 10 December 2016.
- "Water Buffalo". <http://en.wikipeida.org/wiki/water_buffalo> Acccessed july 30, 2011